AFKĀR *Journal of Islamic & Religious Studies*
Volume 6, Issue 1, June 2022, PP: 267-286
E-ISSN 2616-8588; P-ISSN 2616-9223
www.afkar.com.pk; hjrs.hec.gov.pk

شیخ محمد الغزالی کے فقہی واستنباطی اسلوب سیرت نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

Analytical Study of Jurisprudential and Inferential Methodology of Sīrah writings by Sheikh Muhammad Al- Ghazālī

Niaz Ahmad[1*], Prof. Muhammad Idrees Lodhi[2]
[1] Lecturer (Islamic Studies), Govt. Graduate College Burewala, Vehari, Pakistan
[2] Director Seerat Chair, Bahauddin Zakariya University Multan, Pakistan

ABSTRACT

The life of the Prophet Muhammad (peace be upon him) is the best example for all human beings. He is the only personality among the Prophets whose life has been preserved forever. Every aspect of the blessed life of the Prophet (peace be upon him) was compiled with utmost care and was given the name of his Sīrah. There are different styles and methods for Sīrah's writing. One of them is the jurisprudential and inferential style. Understanding of the divine laws and their objectives is based on complete familiarity with the life of the Prophet (peace be upon him). Without thorough familiarity with the Sīrah, the claim of understanding the Islamic Shari'ah is entirely baseless. In this article, an analytical study of the style adopted by Sheikh Muhammad Ghazālī has been presented. The article began with a brief discussion of the aims, requisites and various aspects of Sīrah. Then, focusing on Ghazālī's work, the researcher explained the relationship between Sīrah and the Quran, extracting lessons and jurisprudential elements and finding pearls of wisdom from Sīrah. The article also includes the distinctions of Ghazālī in Sīrah writing, such as answering orientalists and the common questions, criticising the unauthentic Sīrah traditions and the significance of Sīrah in solving contemporary issues. The jurisprudence and inferential styles of Sīrah writing began in the early twentieth century, referring to the derivation of Sharī'ah commands, sermons, wisdom, and lessons from Sīrah. This style has been used more by Arab biographers.

Keywords: *Ghazālī, Arab Biographers, Inferential Styles, Contemporary Issues.*

CC BY

تمہید:

سیرت النبی ﷺ ایک لامتناہی سمندر ہے جس کی حدود و گہرائی کا اندازہ ناممکن ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ تمام انسانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ تمام انبیاء کرام میں سے آپ ﷺ وہ واحد ہستی ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا گیا اور اصطلاحی طور پر اسے سیرت کا نام دیا گیا۔ سیرت نگاری میں عموماً کسی خاص اسلوب و منہج اور اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس لیے سیرت نگاری کے سلسلے میں مختلف اسلوب و مناہج پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک فقہی و استنباطی منہج و اسلوبِ سیرت نگاری ہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے فقہی واستنباطی اسلوب کے نام سے مطالعہ سیرت کا ایک نیا انداز سامنے آیا ہے۔ لغوی طور پر اس کا معنی علوم و فنون کا گہرا ادراک ہے جبکہ اصطلاحی مفہوم میں اس سے مراد واقعات سیرت سے شرعی احکام، مواعظ و حِکَم اور دروس وعبر کا استنباط ہے۔ ڈاکٹر فاروق حمادہ اپنی کتاب "مصادرالسیرۃ النبویۃ وتقویمها" میں اسی معنی کو لیا ہے۔[1] ڈاکٹر محمود احمد غازی فقہ السیرۃ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بیسویں صدی کی ابتدا میں فقہ السیرۃ کے نام سے مطالعہ سیرت کا ایک نیا انداز سامنے آیا ہے۔ اس کا مقصد محض سیرت کی تاریخی تفصیلات سے اعتناء کرنا نہیں بلکہ اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ سیرت کے ان تاریخی واقعات اور تفصیلات میں جو سبق پنہاں ہے اس کو نمایاں کیا جائے۔ جو بصیرتیں اور حکمتیں سیرت پاک میں پوشیدہ ہیں ان کو سامنے لایا جائے۔ اس کاوش کا نام بہت سے حضرات نے فقہ السیرۃ رکھا ہے۔"[2]

سیرت کے بہت سے واقعات بالخصوص مغازی و سرایا اور مہمات رسول ﷺ اسلامی قوانین کا ماخذ ہیں۔ اس اندازِ سیرت نگاری پر بہت سا کام ہوا ہے اور واقعاتِ سیرت سے فقہی مسائل اور دروس وعبر کے اخذ واستنباط کے لیے فقہ السیرۃ کے نام سے باقاعدہ کئی کتبِ سیرت مرتب کی گئی ہیں۔ اس اسلوب کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس میں سیرت کے مختلف گوشوں کی مدد سے شرعی احکام کا تعین کیا جاتا ہے۔[3] اور یہی وہ پہلو یا اسلوب ہے جس کے لیے سب سے زیادہ فقہ السیرۃ کی اصطلاح کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس اسلوب کی نمائندہ کتب میں علامہ ابن قیم کی "زادالمعادفی ہدی خیرالعباد" کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ اس اسلوب پر عربی زبان میں ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کی "فقہ السیرۃ" اور شیخ محمد الغزالی کی "فقہ السیرۃ" بہت اہم ہیں۔ اردو زبان میں عبدالرؤف داناپوری کی کتاب "اصح السیر" اس اسلوب کی شاندار کتاب ہے۔ ان کتب کے علاوہ بھی اس منہج پر عربی اور اردو زبان میں کئی کتب سیرت لکھی گئی ہیں لیکن اس منہج واسلوب کو عرب سیرت نگاروں نے زیادہ استعمال کیا ہے۔ اس تحقیقی مقالہ میں شیخ محمد غزالی کے اختیار کردہ منہج واسلوب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

علامہ محمد الغزالی (1917ء-1996ء) کا مختصر تعارف:

علامہ محمد الغزالی (ہفتہ 5 ذی الحجہ 1335ھ / ستمبر 1917، 22ء- ہفتہ 20 شوال 1416ھ / 9 مارچ 1996ء) ایک مصری اسلامی اسکالر اور مفکر ہیں جنہیں جدید دور میں اسلامی فکر کے حامیوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ وہ مذہبی انتہا پسندی اور مبالغہ آرائی کے مخالفین میں سے ایک تھے۔ اسلامی دنیا کے حکمرانوں پر تنقید ان کے لیے بہت ساری پریشانیوں کا باعث بنی۔

عالم دین، مفکر اسلام، مؤثر خطیب، عظیم مصلح، ادیب اور باکمال مصنف تھے۔ محمد الغزالی 5 ذی الحجہ 1335ھ بمطابق 22 ستمبر 1917ء کو مصر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک مذہبی گھرانے میں پرورش پائی۔ ان کے پانچ بھائی تھے۔ انہوں

نے دس سال کی عمر میں گاؤں کے اساتذہ سے قرآن مجید حفظ کیا۔اس کے بعد انہوں نے اسکندریا کے ایک مذہبی ادارے میں داخلہ لیااوروہاں پر تعلیم مکمل کی۔اس کے بعد وہ 1937ء میں قاہرہ چلے گئے اورالازہر میں کلیہ اصول الدین میں داخلہ لیا۔کالج میں تیسرے سال کی تعلیم کے دوران اخوان المسلمین میگزین میں ان کی تحریریں چھپنا شروع ہو گئیں۔اس کے بعد وہ اس گروپ کے بانی امام حسن البناءسے واقف ہوئے جنہوں نے انہیں لکھنے کی مزید ترغیب دی۔1943ءمیں دعوت وارشاد میں تخصص کی ڈگری حاصل کی۔انہوں نے شیخ عبدالعظیم الزرقانی، شیخ محمود شلتوت، شیخ محمد ابوزہرہ،ڈاکٹر محمد یوسف موسی، شیخ محمد محمد المدنی اورالازہر کے دیگر علمائے کرام سے علم حاصل کیا۔

آپ نے اپنی تمام زندگی اسلام کی خدمت میں صرف کردی۔نصف صدی تک وزارت الاوقاف کی مساجد میں امامت، خطابت اوردرس وتدریس سے وابستہ رہے۔جامعۃ الازہر، جامعہ ملک عبدالعزیز اور جامعہ ام القریٰ میں بھی تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے اور تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے۔آپ پچیس سے زائد کتب کے مصنف ہیں جن میں سے فقہ السیرۃ ایک نہایت اہم اور بنیادی کتاب ہے۔[4]

علامہ محمد غزالی کی کتاب"فقہ السیرۃ"نہایت جاندار اور محرک للعمل ہے۔آپ نے مقدمہ میں واضح کردیاہے کہ میں آپ ﷺ کی محبت میں یہ کتاب لکھ رہاہوں اور میں اس کتاب کے ساتھ کماحقہ انصاف نہیں کرسکوں گا۔ان کے مطابق اس کتاب کا مقصد مسلمانوں کے دلوں میں نبی کریم ﷺ کی حقیقی محبت جاگزین کرناہے کیونکہ ان کے نزدیک آج لوگ ظاہری الفاظ کے ساتھ محبت وعقیدت کا اظہار توکرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں آپ ﷺ سے محبت کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔

مطالعہ سیرت کا بنیادی مقصد:

سیرت نبوی ﷺ کی تفہیم جدید اوراسے عصر حاضر کے حالات وواقعات اور مسائل پر منطبق کرنے کے حوالے سے محمد الغزالی کی فقہ السیرۃ بنیادی اہمیت کی حامل ایک معتبر کتاب ہے۔مصنف کے مطابق اگر سیرت کا درست فہم حاصل نہ ہو، مطالعہ سیرت سے ہمتیں بیدار نہ ہوں، زندگی سنوارنے کا جذبہ پیدا نہ ہو اور سنت پر عمل کرنے کی تحریک پیدا نہ ہو تو چاہے جتنا بھی درودوسلام پڑھتے رہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔اس حوالے سے وہ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں :

"جس مسلمان کے دل میں پیارے نبی ﷺ جاگزیں نہ ہوں، جو فکر وعمل میں آپ ﷺ کی پیروی کی کوشش نہ کرے وہ چاہے دن رات میں زبان سے ایک ہزار درود پڑھے فائدہ نہیں ہوگا۔"[5]

غزالی کے مطابق چونکہ سیرت کی ظاہری صورتوں کے بیان کرنے میں زیادہ محنت صرف نہیں ہوتی اس لیے لوگوں نے ظاہری طریقوں سے زبانی حدتک آپ ﷺ سے محبت کا اظہار کرنا شروع کردیااور سیرت کے حقیقی تقاضوں کو نظر انداز کردیاکیونکہ اس سے اپنے آپ کو تبدیل کرناپڑتاہے، جدوجہد کرناپڑتی ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے مشکل کام ہے جو دین کی روح تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

غزالی کے مطابق مسلمانوں کو سیرت سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اوراس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے رسالت اور صاحب رسالت کو صحیح انداز میں سمجھاجائے اوردرست طریقے سے پیروی کی جائے کیونکہ اگر محبت صرف الفاظ کا کھیل ہو تو نہایت آسان ہے اوراگر اس کا مطلب نقش قدم پر چلنا اوراتباع کی ذمہ داری اٹھاناہو تو پھر یہ بہت دشوار اور گرانقدر ہوگیااور آخرالذکر ہی حقیقی محبت اوراتباع ہے جسے اللہ تعالی نے اپنی اطاعت اوراتباع قرار دیاہے اور یہی محبت واطاعت اللہ اوراس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اوررضا کا ذریعہ اور حصول جنت کا راستہ ہے۔

سنت نبوی ﷺ کی ترجمانی:

مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سرچشموں کو سمجھے جن سے وہ اپنادین اخذ کرتا ہے۔ قرآن کریم کی صورت وحی الٰہی کے محفوظ ریکارڈ کی ہے۔ قرآن اسلام کی روح ہے۔ اس کی محکم آیات ہی اسلام کا دستوراوراس کی دعوت کا محور ہیں۔ جس شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کا بوجھ اٹھانے اوراپنی آیات کو پہنچانے کے لیے منتخب فرمایاوہ زندہ قرآن کی حیثیت رکھتی ہے۔اس لیے آپ ﷺ کے اقوال، افعال، تصدیقات، سلوک واخلاق، احکام اورزندگی کے تمام پہلواہل ایمان کے لیے قانون اوردین کے اہم عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انبیاء کواپنی ترجمانی کے لیے منتخب کرتا ہے۔اس لیے آپ ﷺ سے زیادہ کون اللہ تعالیٰ کی مراد کو سمجھنے کے لائق تھا؟اور قرآن کے دوررونزدیک کے تقاضوں کے مطابق موقف متعین کرنے کا آپ ﷺ سے زیادہ کس کو حق ہوسکتا تھا؟ قرآن اسلام کا قانون اور سنت اس کی تطبیق ہے۔ آپ ﷺ اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتے تھے۔اس لیے آپ ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت ہوئی۔[6] تاہم آسمانی الہام انسان کی صلاحیتوں کو معطل نہیں کردیتا۔ یہ سمجھناغلط ہوگا کہ رسول حضرات مسخرلوگ تھے جنہیں فرشتے بلواتے یاچپ رکھتے تھے۔اگروہ حضرات رسول نہ ہوتے تب بھی اپنی صلاحیت وصالحیت کی بناء پرلوگوں کے لیے قابل احترام ہوتے۔کسی کووحی اتفاقاً نہیں مل جاتی۔اس سے تو ایسے اشخاص کونوازاجاتاہے جولوگوں میں سب سے مکمل وفاضل، اخلاق وکردار میں سب سے شریف اورسب سے پختہ رائے رکھنے والے ہوں۔زندگی میں ان کی بات اور سیرت کو ویسے بھی نظرانداز نہیں کیاجاسکتاچہ جائیکہ جب انہیں نبوت ورسالت کے ذریعہ معصومیت سے بھی نوازاگیاہو۔[7]

سنت کے ترجمان کی خصوصیات:

البتہ یہ کہاجاسکتاہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ترجمانی کرنے والوں میں ایسی خصوصیات ہونی چاہییں جواس کا حق اداکرسکتے ہوں۔ہر فرد کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ عظیم الشان ذات کاترجمان بننے کا دعویٰ کرے۔ محمد غزالی نے ابتدامیں ہی یہ خصوصیات واضح کردی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ اس شخص کوسنت کی بات نہیں کرنی چاہیے جس نے قرآنی علوم میں کافی مہارت حاصل نہ کرلی ہوکیونکہ قرآن ہی اسلام کا اصل دستورہے اوروہیمسلمان کے حقوق وفرائض طے کرتا ہے۔ان سے متعلق ذمہ داریاں طے کرتا ہے اوراس کی زندگی میں اس طرح عبادات کو تقسیم کرتا ہے کہ نہ کوئی عبادت دوسری عبادت کودباتی ہے اورنہ ساری عبادات مل کرزندگی کے لیے کام اوراس کے مرتبہ ومقام کوپیچھے دھکیلتی ہیں۔جو شخص قرآن سے یہ حقائق حاصل نہیں کرتا کوئی دوسری چیزاس کمی کا بدل نہیں ہوسکتی۔اسی لیے صحابہ شدت سے چاہتے تھے کہ قرآن کے لیے راستہ خالی رکھاجائے تاکہ وہ دلوں میں اچھی طرح اپنی جگہ بنالے۔

2۔ فہم قرآن میں مہارت کے بعد فہم حدیث کادرجہ ہے۔جو فہم حدیث میں کوتاہ ہواسے چاہیے کہ وہ اپنی زبان منہ میں بندرکھے۔ حدیث قدیم زمانے سے ایسے لوگوں کی وجہ سے آزمائش میں مبتلارہی ہے جویادتوبہت رکھتے ہیں لیکن سمجھتے بہت کم ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت بلالؓ کے اندازروایت پرتعجب اس لیے نہیں کیاتھاکہ انہیں جھوٹا سمجھتی تھیں بلکہ اس لیے کہ ان کے اندازروایت میں پس منظر اورسیاق وسباق کالحاظ نہیں تھا۔ مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کوزدوکوب

کیا جب انہیں یہ روایت کرتے ہوئے سنا کہ "جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں جائے گا۔" تاکہ کم فہم لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اسلام صرف زبان سے کلمہ کی ادائیگی کا نام ہے اس کے بعد کسی عمل کی ضرورت نہیں۔

3۔ کثرت سے حدیث میں مشغول رہنے کے باوجود اس میں مہارت کی کمی نے بہت نقصان پہنچایا اور بہت سے ایسے احکام اور روایات رائج ہو گئیں جو قرآن و سنت کی روح سے متصادم تھے۔ اہم معاملات میں اسلام متعدد احکام لے کر آیا جن کا ذکر قرآن میں ہے یا وہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جاری ہوئے۔ یہ احکام ایک دوسرے سے مل کر مکمل ہوتے ہیں۔ اگر ان احکام کے دلائل میں کوئی تضاد ظاہر ہو تو اس کی تاویل تلاش کی جائے گی تاکہ سب کے ساتھ ہم آہنگی ہو جائے یا پھر زیادہ مضبوط سند والی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ مختصر یہ کہ احادیث کی روح کو نہ سمجھنا اور ظاہری الفاظ پر تکیہ کر کے کوئی حکم لگا دینا مناسب نہیں ہے۔ اس سے احکام میں تضاد کی صورت پیدا ہوتی ہے اور نااہلوں کو بلاوجہ حدیث پر اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس لیے حدیث بیان کرنے میں حد درجہ احتیاط ضروری ہے۔[8]

سیرت النبی ﷺ پر عمل کی ضرورت:

محمد الغزالی کی سیرت نگاری کا اسلوب اچھوتا اور نہایت منفرد ہے۔ جہاں وہ ایک طرف واقعات سیرت کو بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف عصر حاضر میں مسلم معاشروں اور ان میں پائی جانے والی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان مسائل کے حل کے لیے ایک نہایت ہی مؤثر لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی خاص اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ اپنے تجویز کردہ لائحہ عمل کی بنیاد قرآن پاک اور سیرت نبوی ﷺ کے واقعات پر رکھتے ہیں جس سے اس کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے اور سیرت نبوی ﷺ کی تفہیم اور اس پر عملدرآمد کی افادیت کا پتہ چلتا ہے۔ غزوہ احد میں عبد اللہ بن ابی کی ساتھیوں کے ساتھ واپسی اور گھاٹی پر مقرر تیر انداز صحابہ کا مال غنیمت کی لالچ میں گھاٹی کو چھوڑ دینے کے واقعہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس موقع پر احکام کی جو خلاف ورزی ہوئی اس سے مسلمان اطاعت کی قدر و قیمت جان سکتے ہیں۔ اجتماعی معاملات میں انفرادی رائے اور رجحان پر عمل لامحالہ ناکامی کی طرف لے جاتا ہے۔ بہترین نظم و ضبط اور اطاعت کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو بہترین کمانڈر کی ہوتی ہے۔ جس طرح احکام جاری کرنے کے لیے دانشمندی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ان کے نفاذ کے لیے بھی ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اطاعت ہی بھلائی اور کامیابی کا ذریعہ ہے۔[9]

مصادر کتاب:

آپ نے سیرت کے مواد کے لیے قرآن مجید کو مصدر اول کے طور پر لیا ہے۔ کتب حدیث میں سے صحاح ستہ، مستدرک للحاکم، امام طحاوی اور ذہبی کی کتب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کتب سیرت میں سیرت ابن ہشام، کتاب المغازی للواقدی، طبقات ابن سعد، البدایہ والنہایہ لابن کثیر آپ کے پیش نظر رہی ہیں تاہم زیادہ تر روایات ابن ہشام، ابن سعد اور ابن کثیر سے لی گئی ہیں۔

اختصار:

غزالی کی کتاب کی ایک نہایت اہم خصوصیت اختصار ہے۔ واقعات سیرت کو انتہائی مختصر لیکن بہت ہی جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ رطب و یابس کو اکٹھا کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ واقعات کی جزئیات اور تفصیلات میں جانے کی بجائے واقعات کے مرکزی حصے کو بیان کرتے ہیں

اور اس سے کوئی حکمت یا سبق اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔واقعہ معراج کا ذکر ان مختصر الفاظ میں کرتے ہیں۔

"معراج کا عجیب و غریب سفر مسجد خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ کی طرف شروع ہوا۔پھر وہ آسمانوں کے طبقات کو پار کرتا ہوا اس بلندی تک پہنچا جس کی ہیئت و کیفیت سے دنیا کی مخلوقات ناواقف ہیں۔پھر مکہ مکرمہ میں مسجد خانہ کعبہ میں واپسی ہوئی جس کا ذکر قرآن مجید کی دو سورتوں میں ہوا ہے۔"[10]

اس طرح نہایت ہی مختصر الفاظ میں واقعہ معراج کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اس واقعہ سے متعلق اختلافی معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں پر بہت ہی زیادہ اختصار کو اپنایا گیا ہے لیکن یہ ان کا انداز ہے جس کے مطابق ایسی ابحاث پر وقت صرف کرنا چاہیے جن پر کسی چیز کا مدار ہو۔ سفر کی جزئیات اور تفصیلات بیان کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس بات کو اجاگر کرنا کہ اس واقعہ سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے، زیادہ اہم ہے۔ اس واقعہ سے آپ ﷺ کی نبوت کی ایک اہم نشانی ظاہر ہوتی ہے اور آپ ﷺ کی عظمت و شان کی وضاحت ہوتی ہے۔اس سفر میں آپ ﷺ کو کیا احکامات دیے گئے ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ محمد غزالی نے ابتداء میں یہ واضح کر دیا ہے کہ ہمیں واقعات سیرت کو سمجھنے اور ان سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہم میں سے اکثر نے واقعات کو محض بیان کرنے پر اکتفا کر لیا ہے اور ان میں موجود نصائح اور حکمتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ انہوں نے پوری کتاب میں اس رائے کو پیش نظر رکھا ہے اور حتی الامکان غیر ضروری ابحاث سے گریز کیا ہے۔

سیرت، قرآن کی روشنی میں:

محمد غزالی کی کتاب کو قرآن پاک کی روشنی میں سیرت النبی ﷺ قرار دیا جا سکتا ہے۔اس کتاب میں تقریباً تمام واقعات سیرت کا قرآن پاک سے ربط بیان کیا گیا ہے جس سے اس نظریہ اور تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت قرآن ہے۔واقعات سیرت کے پس منظر کو بیان کیا گیا ہے اور قرآنی آیات سے ان کی تائید کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب قرآن فہمی کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے۔ بہت سی آیات کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے اور اس سے ثابت شدہ احکام کی حکمت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ واقعات سیرت کی تائید میں وارد ہونے والی آیات کے بیان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

1۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کے دعویٰ کے اثبات کے لیے رسول اللہ ﷺ سے محبت کا ثبوت ضروری ہے۔ یہ فطری ترتیب ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭوَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"[11]"(اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف فرما دے گا، اور اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے۔"

2۔ قرآن کریم نے پہلے ہی دن سے اہل دانش کو قائل و مطمئن کرنے کی ذمہ داری لے لی تھی۔ معجزات تو محض آپ ﷺ کی عزت افزائی کے پیش آئے۔اسی لیے جب مشرکین نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ ﷺ آسمان پر چڑھ کر دکھائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ"قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا "[12]"فرما دیجیے: میرا رب (ان خرافات میں الجھنے سے) پاک ہے میں تو ایک انسان (اور) اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔"

قرآن کی آیات سے واقعات سیرت کا ربط ثابت ہونے سے اس واقعہ کی اعتباری حیثیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔اس طرح سیرت

کی تفہیم، قرآن فہمی کا ذریعہ بنتی ہے اور قرآن فہمی سیرت کی تفہیم کا ذریعہ بنتی ہے۔اس سے آپ ﷺ کی عظمت وشان کا اظہار ہوتا ہے۔اس انداز تحریر سے قرآن کی ترتیب نزولی سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو قرآنی احکامات کے پس منظر جاننے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

دروس واسباق کا استنباط:

علامہ غزالی نے خاص طور پر "النبی ﷺ وخوارق العادات" کا عنوان باندھ کر پیغمبر ﷺ کے حامل نبوت ورسالت، خاتم النبیین اور محمد رسول اللہ ﷺ ہونے کے باوجود آپ ﷺ کے اسباب ووسائل اور تدابیر اختیار کرنے کے عمل کو واضح کیا ہے اور مسلمانوں کے طرز عمل پر افسوس کا اظہار کیا ہے جو خوارق عادات، معجزات اور کرامات کے منتظر ہیں جبکہ دنیا ان کی گھات میں لگی ہوئی ہے۔[13]

بنو قریظہ کی طرف جانے والے صحابہ میں سے بعض کا راستے میں نماز پڑھ لینا اور بعض کا بنو قریظہ میں جاکر پڑھنا مصنف کے نزدیک نیک نیتی کی بنیاد پر ظاہری الفاظ اوراور حکم کی حکمت ومقصد کو سمجھنے کی الگ الگ کوشش ہے اور ثواب دونوں کا حصہ ہے۔مصنف پیغمبر ﷺ کے اس فرمان "عزمت عليكم أن لاتصلوا العصرحتى تأتوابني قريظة" کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ آج مسلمانوں کو اپنے طرز عمل کا جائزہ لیناچاہیے۔جو مدرس اپنے شاگردوں کو تعلیم دینے سے، جو تاجر اپنی تجارت وسرمایہ کاری کو فروغ دینے سے اور جو ملازم اپنی ڈیوٹی یا فرض انجام دینے سے پہلو تہی یا غفلت کرے تو اللہ تعالیٰ ان فرائض کو ضائع کرنے کے سلسلے میں کوئی عذر قبول نہیں فرمائے گا چاہے وہ سو رکعت نفل نمازیں پڑھے یا ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے یا ستر ہزار بار اسمائے حسنیٰ کا ورد کرے جیسا کہ جاہل صوفیا کیا کرتے ہیں۔اس لیے کہ غیر مطلوبہ نوافل کی بناء پر مطلوب فرائض سے پہلو تہی اور ایک امت کو معطل و بیکار کرنا ہوگا۔[14] بنو قریظہ کے واقعہ کے ضمن میں ہی مصنف نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے جنگ کے عذر کے سبب نماز کے وقت میں ڈھیل دی ہے یہی امام بخاری کا مسلک ہے اور میری رائے بھی یہی ہے۔[15]

ہجرت کی بحث سے مؤلف یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لیے اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے بہترین تیاری ضروری ہے۔ خدائی تائید کے استحقاق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسباب کے استعمال میں کوتاہی کی جائے۔آپ ﷺ نے ہجرت کا منصوبہ بنایا اور تمام امکانات کو مد نظر رکھ کر تیاری فرمائی، محض قسمت کے بھروسے پر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔زادراہ کی تیاری، سواریاں، امانتوں کی سپردگی، ماہر گائیڈ انتہائی رازداری یہ وہ تمام ضروری تدابیر تھیں جو آپ ﷺ نے اختیار فرمائیں۔یہی مومن کی شان ہے کہ وہ تمام وسائل اور اسباب کو اختیار کرتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید کے بغیر کوئی بھی ذمہ داری انجام پذیر نہیں ہوسکتی۔[16]

غزوہ احد کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں معرکہ احد قیمتی اسباق اور نصیحتوں سے بھرا ہوا ہے۔اس کے سلسلے میں بہت سی آیات نازل ہوئیں اور اس کا گہرا اثر آپ ﷺ کے دل پر رہا۔معرکہ شروع ہونے سے پہلے ہی منافقین کا سردار عبد اللہ بن ابی اپنے ساتھیوں سمیت واپس ہوگیا تھا۔یہ انتہائی سخت حالات میں اسلام کے مستقبل سے غداری تھی جو نفاق کی سب سے بڑی علامت ہے۔کسی بھی دعوت وتحریک کے پھیلاؤ اور کامیابی کے وقت اس میں مخلص اور غیر مخلص دونوں طرح کے لوگ شامل ہوجاتے ہیں اور یہ بات خود دعوت کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔یہ دعوت کے حق میں ہوتا ہے کہ ایسے شدید جھٹکے لگیں جن سے غیر مخلص مفاد پرست لوگ اس سے الگ ہوجائیں۔معرکہ احد میں اللہ تعالیٰ کی حکمت نے ایسا ہی چاہا "مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ"[17] بزدلی و پست ہمتی نے منافقین کے دلوں کی حالت ظاہر کردی اور اس سے پہلے کہ

آسمان کی طرف سے ان کا نفاق ظاہر کیا جائے انہوں نے خود کو لوگوں کے سامنے اور خود اپنے سامنے رسوا کر لیا۔[18]

بنو قریظہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کا سبب قیادت و سربراہی تھی۔ قومیں اپنے رہنماؤں کی غلطیوں کی بھاری قیمتیں چکاتی ہیں۔ فتح مکہ سے قبل حضرت حاطبؓ کی غلطی جس میں انہوں نے اہل مکہ کو پیشگی اطلاع دینا چاہی تھی، سے ثابت کرتے ہیں کہ اگر ہمیشہ اچھے کام کرنے والوں سے کبھی کبھار کوئی کوتاہی ہو جائے تو ان کے سابقہ کردار اور کاموں کو بھولنا نہیں چاہیے۔[19]

واقعات سیرت سے مستنبط حکمتوں کا بیان:

اسوہ رسول اکرم ﷺ مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے اور آپ ﷺ کی سیرت کے واقعات میں بے شمار مواعظ و حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ ان حکمتوں کی تفہیم اور تلاش اہل محبت اور اہل ایمان کی جستجو میں شامل رہی ہے۔ علامہ محمد غزالی نے واقعات سیرت سے مستنبط حکمتوں کو جابجا بیان کیا ہے جس سے سیرت کے مطالعہ کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور ان ایمان افروز حکمتوں اور اسباق سے دل یقین سے لبریز ہو جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ اور گزشتہ انبیاء کے دعوتی مزاج کا فرق:

علامہ محمد غزالی آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کی حکمت اور مزید انبیاء کی آمد کی ضرورت نہ ہونے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت مختلف زمانوں اور علاقوں میں بھیجے جانے والے نبیوں کے ایک لشکر کا معجزانہ بدل ہے۔ ان کے مطابق سابقہ انبیاء کی مثال ایک ایسے رہبر کی ہے جو ہاتھ پکڑ کر کسی کو راستہ پار کرا دیتا ہے۔ جبکہ آپ ﷺ کی مثال ایک ایسے رہنما کی ہے جو ابتدا میں ہی اچھی طرح راستہ سمجھا دیتا ہے اور تھوڑی دور تک ساتھ چل کر عملی تربیت بھی کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ خود اپنے رہبر بن جائیں گے اور اپنی سمجھ سے کام لے کر دوسروں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی بعثت کے ساتھ آپ ﷺ کی رسالت کے اصول و قواعد بھی وضع کر دیے جن سے عقلیں تفصیلات جان سکتی ہیں۔ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد مخلوق اور اللہ کے درمیان تعلق کی کڑی اور روشنی بنانا تھا جس سے وہ اپنی منزل دیکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا"[20]

"اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے (ذات محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صورت میں ذات حق جل مجدہ کی سب سے زیادہ مضبوط، کامل اور واضح) دلیل قاطع آگئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف (اسی کے ساتھ قرآن کی صورت میں) واضح اور روشن نور (بھی) اتار دیا ہے۔ پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس (کے دامن) کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو عنقریب (اللہ) انہیں اپنی (خاص) رحمت اور فضل میں داخل فرمائے گا، اور انہیں اپنی طرف (پہنچنے کا) سیدھا راستہ دکھائے گا۔"

واقعہ معراج کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اپنی قدرت کے بڑے بڑے مظاہر کے جاننے پہچاننے کا موقع دیتا ہے تاکہ ان کے دل مزید یقین سے بھر جائیں کیونکہ انہیں دن رات منکرین کے ساتھ سخت معرکہ آرائی کرنی ہوتی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کے عجائب دکھانے کا ارادہ فرمایا تو انہیں حکم ہوا کہ اپنا عصا ڈال دیں۔[21] پھر جب حضرت موسیٰؑ کا دل ان بڑی نشانیوں کے مشاہدے سے مسرور ہو گیا تو حکم ہوا کہ اب تو فرعون کے پاس جا کیونکہ وہ

سرکش ہو گیا ہے۔[22]

اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں معراج پر بلایا اور انہیں ممتاز کیا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ واقعہ معراج بعثت کے بارہ برس بعد پیش آیا جبکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے پہلے ہی آگاہی حاصل کر چکے تھے تو حقیقت یہ ہے کہ پہلے کے انبیاء کی زندگیوں میں معجزات کا مقصد ان کی قوموں کو ان کی نبوتوں کی سچائی پر مطمئن کرنا تھا لیکن آپ ﷺ کا معاملہ دوسرا تھا۔ لوگوں کو قائل کرنے کی ذمہ داری پہلے ہی دن سے اللہ تعالیٰ نے لے لی تھی معجزات تو محض آپ ﷺ کی شخصیت کی عزت افزائی کے لیے پیش آئے۔ اسی لیے جب مشرکین نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ ﷺ آسمان پر چڑھ کر دکھائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ "اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاۗءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا"[23] "یا آپ کا کوئی سونے کا گھر ہو (جس میں آپ خوب عیش سے رہیں) یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں، پھر بھی ہم آپ کے (آسمان میں) چڑھ جانے پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ (وہاں سے) ہمارے اوپر کوئی کتاب اتار لائیں جسے ہم (خود) پڑھ سکیں، فرما دیجیے: میرا رب (ان خرافات میں الجھنے سے) پاک ہے میں تو ایک انسان (اور) اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں" اور پھر جب آپ ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے تو یہ کبھی نہیں فرمایا کہ یہ اس چیلنج یا مطالبہ کا جواب ہے۔[24]

ہجرت مدینہ کے بعد انصار کی طرف سے انتہائی گرمجوشانہ سلوک اور فیاضی کے باوجود مہاجرین کی طرف سے ان کے اس جذبہ کا استحصال نہیں کیا گیا بلکہ انہوں نے محنت کو اپنا شعار بنایا اور چند دنوں میں ان کے مسائل میں خاطر خواہ کمی آنا شروع ہو گئی۔ وہ رسول اللہ ﷺ پر بوجھ بن کر نہیں بیٹھ رہے اور نہ ہی انصار پر بوجھ بنے بلکہ بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کامیاب کوشش کی۔ اس سے بھی یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ عمل اور محنت کو اپنانا چاہیے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد کی امید اور دعا کرنی چاہیے۔

مدینہ میں جب مسلمانوں کے حالات میں استحکام پیدا ہو گیا تو آپ ﷺ نے مسلح دستے آس پاس بھیجنے شروع کر دیے تاکہ دشمن قبائل کے حالات کا پتہ چلائیں اور مکہ مکرمہ اور شام کے درمیان آنے جانے والے قریش کے قافلوں کا راستہ روکیں۔ ان دستوں کے مسلسل بھیجنے میں مندرجہ ذیل حکمتیں پوشیدہ تھیں۔

1۔ مدینہ منورہ کے مشرکین، یہودیوں اور آس پاس کے بدؤں کو یہ جتلانا کہ مسلمان اب طاقتور ہو چکے ہیں۔ پہلے کی طرح کمزور نہیں رہے جس کی بنیاد پر اہل قریش ان پر مظالم کرتے تھے اور ان کو گھروں سے دربدر کرتے تھے۔

2۔ مدینہ منورہ میں بھی مخالفین کی تعداد کم نہیں تھی اور طاقت کا مظاہرہ ہی انہیں قابو میں رکھ سکتا تھا یہی اس آیت کی تشریح ہے۔ "تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ"[25] مدینہ کے منافقین اسلام کے سخت دشمن تھے اور صرف بزدلی اور انجام کے ڈر ہی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ آس پاس کے مشرکین اور صحرا کے ڈاکو اگر ان دستوں کی وجہ سے ڈر نہ جاتے تو خود مدینہ پر ہی چڑھ دوڑتے۔

3۔ تیسری حکمت یہ تھی کہ قریش کو آگاہی دی جائے۔ اہل قریش اب تک اسلام سے برسرپیکار چلے آ رہے تھے اور اپنی ذہنیت نہیں بدل رہے تھے۔ اب بھی وہ مکہ میں کسی کو اسلام قبول کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ مکہ کے سرداروں کو جتلا دیں کہ

ان کا ظالمانہ رویہ انہیں سخت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ زمانہ گزر چکا ہے جب وہ مومنین کو بلا کسی خوف کے ستایا کرتے تھے۔

مستشرقین ان دستوں کو راہزنی قرار دیتے ہیں۔ یہ اس کینہ کی ترجمانی ہے جو حقائق سے اندھا کر دیتا ہے اور خواہش نفس کو بے لگام چھوڑ دیتا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب انگریز اپنی افریقی نوآبادی کینیا میں آزادی کے طلبگاروں کو کچل رہے تھے تو ایک انگریز فوجی نے اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ درندے ہیں۔ سمجھ لو کہ ان میں سے کسی نے تمہیں دانت سے کاٹ لیا ہے لہٰذا اسے قتل کرنا ضروری ہے۔ مستشرقین یہی طرزِ فکر اہل مکہ اور اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں اپناتے ہیں۔[26]

صلح حدیبیہ جن شرائط پر ہوئی تھی انہیں دیکھ کر بظاہر لگتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرنے والی اور اہل قریش کے غرور اور جاہلی حمیت کو تسکین دینے والی ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سوال بھی کیا تھا۔ اور مسلمان مایوسی کا شکار ہو گئے تھے لیکن آپ ﷺ کی دوراندیشی کے نتائج بہت جلد سامنے آنے لگے۔ بہت سے مؤرخین صلح حدیبیہ کو فتح قرار دیتے ہیں۔ ابن شہاب زہری کا خیال ہے کہ اسلام کو اس سے پہلے اس سے زیادہ عظیم فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لوگ اکٹھا ہوتے تو جنگ ہو جاتی لیکن جب صلح ہو گئی اور جنگ ختم ہو گئی تو لوگ ایک دوسرے سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے۔ جب باہم ملے تو گفت وشنید اور تبادلہ خیال ہوا اور جس سمجھدار آدمی کو اسلام کے بارے میں بتایا گیا وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد دو برسوں میں اتنے ہی یا اس سے زیادہ لوگ مسلمان ہوئے جتنے اس سے پہلے پوری مدت میں ہوئے تھے۔[27] ابن ہشام کہتے ہیں کہ زہری کی بات اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حدیبیہ کے لیے نکلے تھے تو آپ ﷺ کے ساتھ صرف چودہ سو اشخاص تھے اور جب صرف دو سال بعد فتح مکہ کے لیے نکلے تو یہ تعداد دس ہزار ہو چکی تھی۔[28]

مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات:

علامہ محمد غزالی واقعات سیرت کے بیان کرنے کے بعد ان سے متعلق مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کی طرف سے دیے گئے جوابات عقلی و منطقی طور پر نہایت واضح اور فیصلہ کن حیثیت کے حامل ہوتے ہیں جن کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

آپ ﷺ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے شام کے سفر کے دوران بحیرا راہب سے کچھ مذہبی تعلیمات سیکھ لی تھیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ بحیرا راہب سے ملنے کا واقعہ صحیح ہو لیکن جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا اس سے کوئی تعلق واضح نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس واقعہ کا بعد میں کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو آپ ﷺ نبوت کی توقع کر لیتے یا اس کی تیاری شروع کر دیتے لیکن آپ ﷺ نے نہ تو اس واقعہ کے بعد نبوت کی توقع کی اور نہ اس کے لیے کوئی تیاری شروع کی۔ اہل قافلہ نے بھی اس واقعہ کو نہیں پھیلایا اور اس طرح بھول گئے جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔[29]

علامہ غزالی انتہائی غیر محسوس انداز میں مستشرقین کے اعتراضات کو مختصر الفاظ میں ذکر کرتے ہیں اور انہیں کے طریقہ کار سے انہیں جواب دیتے ہیں۔ وہ مستشرقین کے اعتراض کے جواب میں اکثر ان کا اپنا عمل انہیں یاد کراتے ہیں جس سے ان کے نقطہ نظر پر سخت چوٹ پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اسلام نے جو جنگ مشروع قرار دی اور جن معرکوں میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ شریک ہوئے انہیں جہاد کی

معزز ترین شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ جنگیں حق کی حمایت و دفاع، مظالم کی روک تھام اور جارحیت اور سرکشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے تھیں۔ مستشرقین اور اسلام سے بغض رکھنے والے دیگر حضرات کا یہ دعویٰ کہ مسلمانوں نے بلاجواز طاقت استعمال کی، بالکل لغو و باطل اور اس مہم کا حصہ ہے جو روئے ارض سے اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو صلیبیت اور صیہونیت کا غلام بنانے کے لیے چلائی جا رہی ہے۔[30]

جہاد کی ضرورت اور حیثیت موجودہ زمانے میں ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ آج جہاد کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ دنیا مہذب ہوگئی اور تمام مسائل کا حل باہمی گفت و شنید سے ممکن ہے اس لیے مذاکرات کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اور اسلام امن کا دین ہے جو کسی پر جارحیت کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاد کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھی بلکہ آج اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ مستشرقین نے جہاد کے نام کو ہی تشدد اور انتہاپسندی سے جوڑ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے آج اس مقدس فریضے کے نام سے ہی مسلمان خود کو قصوروار سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور اس سے پہلو تہی کو تہذیب و ترقی کا نام دیتے ہیں۔ اس حوالے سے علامہ غزالی کا موقف ہے کہ جہاد حق کی حمایت و دفاع، مظالم کی روک تھام اور جارحیت اور سرکشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ہے۔ مستشرقین اور اسلام سے کینہ رکھنے والے حضرات کا یہ دعویٰ کہ مسلمانوں نے بلاجواز اور ظلماً طاقت استعمال کی، بالکل لغو و باطل اور اس مہم کا حصہ ہے جو روئے زمین سے اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو صلیبیت اور صیہونیت کا غلام بنانے کے لیے چلائی جا رہی ہے۔

جب اسلامی علاقے دنیا کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں جا پڑے ہیں اور اسے آہستہ آہستہ نیست و نابود کرنے کے انتہائی گھناؤنے منصوبے تیار کیے جا رہے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی کے لیے تیار رہنے کی بات کو کیسے عجیب و غریب کہا جاسکتا ہے؟ جس امت کے ارد گرد ہر طرف کے قصاب گھیر اڈال رہے ہوں اس کے لیے جانثاری کی بات کیسے ناپسندیدہ قرار دی جائے گی؟ وحی کی ہدایت اور حقیقت کے تقاضے کے مطابق نیز اللہ تعالیٰ کے حق اور زندگی کے حق کے تحفظ کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے لوگوں کو فنون حرب سیکھنے کی تلقین فرمائی اور اس کی مشقوں میں خود بھی حصہ لیا اور اس میدان میں ہر سرگرمی کو بہترین عبادت قرار دیا تو آج یہ عبادت ناپسندیدہ کیسے ہوگئی؟[31]

فقہی مسائل کا اخذ و استنباط:

علامہ محمد غزالی نے اپنی کتاب کے نام کے برعکس اس میں فقہی احکام سے متعلق بہت کم گفتگو کی ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقہی احکام سے متعلق ابحاث کتاب میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہت کم مواقع ہیں جہاں پر کسی فقہی مسئلہ کی سے متعلق بات کی ہے اور وہ بھی انتہائی مختصر الفاظ میں ہے۔ اس حوالے سے غزوہ بنو قریظہ کے لیے جاتے ہوئے جب کچھ صحابہ کرام نے راستے میں نماز عصر ادا کرلی اور بعض نے بنو قریظہ میں جا کر نماز ادا کی تو اس سے متعلق کہتے ہیں کہ بعض علماء نے جنگ کے عذر سے نماز کے مقررہ وقت میں ڈھیل دی ہے اور یہی بخاری وغیرہ کا مسلک ہے اور میرے نزدیک یہی درست سے قریب تر ہے کیونکہ بندوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں زندگی میں ان کی ترتیب اہمیت رکھتی ہے۔ ایک مسلمان دین کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک اس ترتیب کو نہ سمجھ لے۔ اسلام مختلف ہدایات و اعمال کا نام ہے۔ کچھ فرائض ہیں اور کچھ نوافل۔ ہمیں لازمی طور پر جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ فرض کی ادائیگی سے پہلے کوئی نفل قبول نہیں کرتا۔ جو شخص ضروری فرائض کو چھوڑ کر نفلی اعمال زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ گمراہ ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے بجا طور پر فرمایا کہ مزید تیاریوں کا موقع دیے بغیر بنو قریظہ کو جالینا اس وقت کا اولین فریضہ ہے۔ اس میں نماز کی وجہ سے بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔[32]

فتح مکہ کی بحث میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں رمضان میں داخل ہوئے تھے اور وہاں تقریباً انیس دن رہے تھے۔ اس دوران آپ ﷺ نماز قصر فرماتے رہے اور روزے بھی نہیں رکھے۔ آپ ﷺ مدینہ منورہ سے روزہ کی حالت میں نکلے تھے اور پھر راستے میں آپ ﷺ نے اور آپ کے ساتھیوں نے بھی روزہ نہیں رکھا۔ جب صورتحال مستحکم ہوگئی تو تب آپ ﷺ نے لوگوں سے اسلام کی بیعت لینا شروع کی۔ عورتوں سے آپ ﷺ مصافحہ نہیں کرتے تھے بس زبانی بیعت لے لیتے تھے۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ نہیں چھوا۔[33] اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی غیر محرم عورت کو چھونا جائز نہیں ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں پیر حضرات کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بیعت یا کسی اور بہانے سے غیر محرم عورتوں سے میل جول کریں یا ان سے مصافحہ وغیرہ کریں۔

غزوہ ذات السلاسل میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو ایک سرد رات میں احتلام ہو گیا تو انہوں نے اپنی جان کے خوف سے قرآنی آیت کی روشنی میں تیمم کر کے صحابہؓ کو نماز پڑھائی۔ صحابہؓ نے جب حضور ﷺ سے یہ شکایت کی تو آپ ﷺ مسکرا دیے اور ان کے اجتہاد کو برقرار رکھا۔ مصنف نے یہاں سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر پانی کا استعمال خطرہ جان ہو تو تیمم کرنا جائز ہے۔[34]

عصر حاضر میں مسلمانوں کی بے عملی کی نشاندہی:

علامہ محمد غزالی اپنی کتاب میں جابجا مسلمانوں کے بے عملی کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس طرز عمل پر شدید تنقید کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں مسلمان عمل سے زیادہ باتوں کے شہسوار ہیں۔ وہ کسی حکم پر عمل کی بجائے بنی اسرائیل کی طرح مختلف قسم کے سوالات کے ذریعے اس حکم سے نجات کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ قریش کا جو فرد بغیر ان کی اجازت کے محمد ﷺ کے پاس آئے گا وہ اسے ان کے پاس لوٹا دیں گے۔ اس شرط میں عورتوں کا ذکر نہیں تھا اور نہ ہی مسلمان ایسا کرنا چاہتے تھے تو اس حوالے سے وحی نازل ہوئی۔ "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَاۗءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ"[35] "اے ایمان والو جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان (کے مومن ہونے) کی جانچ پڑتال کر لو"

علامہ غزالی یہاں مسلم معاشروں کی ذہنیت پر گہری چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر آج ایسا ہو تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ پہلے ہی یہ سوال کر بیٹھے گا کہ ان عورتوں کا امتحان کون لے گا؟ مرد یا عورت؟ اور اگر مرد تو پھر جوان یا بوڑھا؟ اور عورت کا امتحان براہ راست ہو گا یا پردے کے پیچھے سے؟[36] علامہ غزالی کے مطابق مسلم معاشروں میں آج کے دور میں غیر ضروری اور غیر اہم چیزوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس طرح آسان مسائل کو الجھا کر بیان کیا جاتا ہے جس سے دین پر اس کی روح کے مطابق عمل کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

ممکنہ سوالات کے جوابات:

علامہ محمد غزالی جابجا سیرت النبی ﷺ اور اسلام کے حوالے ہونے والے ممکنہ سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ اور ایسے مواقع پر عقلی دلائل کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ابتدائی پر مشقت زندگی کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مختلف انبیائے کرام نے مختلف کام کیے۔ بخاری میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائیں۔ قَالَ:مَا بَعَثَ اللَّهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الغَنَمَ، فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ:نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ[37] کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں عوام کی رہنمائی، کمزوروں کے ساتھ نرمی اور ان کی حفاظت کے لیے جاگتے رہنے کی عادت ڈالی جائے؟

حضرت محمد ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ فکر کی درستگی اور پختہ نظری میں بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ بکریاں چرانے سے پہلے اور بعد میں بھی اور تجارت کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے اور بعد میں بھی۔ آپ ﷺ غفلت زدہ و بدمست لوگوں کے درمیان بیدار قلب و نظر رکھتے تھے۔[38]

وحی کی ابتداء کے حوالے لکھتے ہیں کہ وحی کیا ہے؟ یہ وہ الہام ہے جو ایسی واضح شکل میں دل میں جم جائے کہ کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔ ابتداء میں وحی بہت بوجھل ہوتی تھی۔ بعض اوقات اگر آپ ﷺ کسی سواری پر سوار ہوتے تو سواری وحی کے بوجھ سے بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپ ﷺ تشریف فرما تھے اور ران مبارک حضرت زیدؓ بن ثابت کی ران سے ملی ہوئی تھی۔ حضرت زیدؓ کو اتنا بوجھ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی ران کی ہڈی چیخ جائے گی۔ کہا جا سکتا ہے کہ شروع میں وحی اتنی بوجھل کیوں تھی؟ نیند میں الہام کی صورت میں قرآن نازل کیوں نہیں کیا گیا؟ بیداری کی حالت میں الہام جیسی صورت کیوں اختیار نہیں کی گئی؟ کیا یہ طریقہ دہشت زدگی اور تھکن سے دوچار کرنے سے دور نہ ہوتا؟ تو جواب یہ ہے کہ نزول قرآن کے لیے شروع میں یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی سب اللہ کی طرف سے ہیں اور حضرت محمد ﷺ نے رسالت کے لیے منتخب کیے جانے کے بعد اس بار کو اٹھایا ہے۔ یہ کسی ایسے عبادت گزار کا وہم و تخیل نہیں جو دنیا سے الگ تھلگ کسی گوشہ تنہائی میں غور و فکر کر رہا ہو نہ کسی ایسے فلسفی کی بات ہے جو دلیلیں قائم کرنے اور اپنی بات کو سلیقہ سے پیش کرنے کا ہنر جانتا ہو بلکہ یہ تو خالق کائنات کا کلام ہے۔[39]

واقعہ معراج کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ معراج کا سفر پہلے بیت المقدس کی طرف کیوں ہوا؟ براہ راست سدرۃ المنتہیٰ کی طرف کیوں نہیں ہوا؟ اس کے جواب کے لیے تاریخ پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ نبوتیں ایک طویل عرصہ تک بنی اسرائیل میں رہی ہیں اور بیت المقدس وحی کے نزول کا مرکز، زمین کے لیے اس کے انوار کا سرچشمہ اور خدا کی منتخب قوم کے محبوب وطن کا مرکزی شہر رہا ہے۔ جب یہودیوں نے وحی کی عزت اور آسمانی احکام کو پامال کر دیا تو ان پر خدا کی لعنت نازل ہوئی اور ہمیشہ کے لیے نبوت کا سلسلہ ان سے پھیر دینے کا فیصلہ ہو گیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت دراصل دنیا کی روحانی قیادت کی ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف، ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف اور اسرائیلؑ کی نسل سے اسماعیلؑ کی نسل کی طرف منتقلی تھی۔ یہ حال کو ماضی سے ملانے اور سب کچھ ایک ہی حقیقت میں مدغم کرنے ہی کا سلسلہ تھا کہ اسلام میں مسجد اقصیٰ کو حرم ثالث قرار دیا جائے اور رسول اللہ ﷺ سفر معراج میں وہاں ہو کر آگے جائیں جو ایمان کے سابقہ مرکز کے احترام کی علامت تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سرزمین پر اور اس کے ارد گرد ہدایت کے علمبردار سابق رسولوں کو اکٹھا فرمائے تاکہ وہ آخری رسالت کے علمبردار کا استقبال کریں۔ نبوتیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اور اگلی نبوت پچھلی نبوت کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے انبیاء سے اس کا عہد بھی لیا تھا۔[40]

روایات کی پاسداری؟

علامہ محمد غزالی کے مطابق اسلام روایات پر عمل کرنے کا نام نہیں ہے۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ تعصب ہر حد پار کر جاتا ہے۔ عوام تو آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت سے ہی محروم ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کو سوچنے سمجھنے کی کچھ صلاحیت ملی ہوتی ہے وہ اپنی خواہشات نفس سے آگے نہیں بڑھتے بلکہ کبھی جو کچھ جان بھی لیں تو اسے چھپاتے ہیں اور بسا اوقات اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم

ہوتے ہیں جو پرانی روایات کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی جرات کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے کچھ لوگ تھے جو صنم پرستی کو غلط تصور کرتے تھے اور جانتے تھے کہ ان کی قوم خرافات میں مبتلا ہے لیکن اس سے باز رکھنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ زید بن عمرو بن نفیل ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے۔ بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے زید بن عمرو بن نفیل کو کعبہ شریف سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے دیکھا وہ کہہ رہے تھے:

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَتْ: " رَأَيْتُ زَيْدَ بْنَ عَمْرِو بْنِ نُفَيْلٍ قَائِمًا مُسْنِدًا ظَهْرَهُ إِلَى الكَعْبَةِ يَقُولُ: يَا مَعَاشِرَ قُرَيْشٍ، وَاللَّهِ مَا مِنْكُمْ عَلَى دِينِ إِبْرَاهِيمَ غَيْرِي، وَكَانَ يُحْيِي المَوْءُودَةَ، يَقُولُ لِلرَّجُلِ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَقْتُلَ ابْنَتَهُ، لاَ تَقْتُلْهَا، أَنَا أَكْفِيكَهَا مَئُونَتَهَا، فَيَأْخُذُهَا فَإِذَا تَرَعْرَعَتْ قَالَ لِأَبِيهَا: إِنْ شِئْتَ دَفَعْتُهَا إِلَيْكَ، وَإِنْ شِئْتَ كَفَيْتُكَ مَئُونَتَهَا"[41]

"اے قریش کے لوگو! خدا کی قسم میرے علاوہ تم میں سے کوئی حضرت ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے۔ زید زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کو بچایا کرتے تھے۔ کوئی اگر ایسا کرنا چاہتا تو وہ اس سے یہ کہہ کر لے لیتے کہ میں اس کی کفالت کروں گا۔ جب وہ بڑی ہو جاتی تو اس کے والد سے کہتے تھے کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے حوالے کر دوں ورنہ میں اس کی کفالت کرتا رہوں گا۔"

زید غور و فکر کرنے والے ان چند لوگوں میں سے تھے جو جاہلیت کی برائیوں پر اظہار ناراضگی کرتے تھے لیکن یہ حق پسندی انہیں نبوت کا حقدار نہیں بنا سکتی تھی۔ قدرت اس کے لیے ایک ایسے شخص کو تیار کر رہی تھی جو حق کو پوری طرح واضح کر سکے اور اتنی طاقت رکھتا ہو کہ گمراہی و باطل کی جان توڑ مزاحمت کا سامنا کر سکے۔[42]

غیر مستند روایات سیرت پر تنقید:

علامہ غزالی اپنی کتاب میں جابجا سیرت میں در آنے والی غیر مستند و ضعیف روایات پر تنقید کرتے ہیں اور ان کے کمزور ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ داستانوں کے شوقین کچھ اہل قلم اپنی کتابوں میں ہر رطب و یابس شامل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر تفسیر خازن میں سورۃ ہود کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی میں گوبر بہت اکٹھا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی کی کہ ہاتھی کی دم کو جھٹکا دو انہوں نے ایسا کیا تو اس سے خنزیر کا ایک جوڑا نکلا، پھر خنزیر کو چھوا تو اس سے ایک چوہیا نکلی چنانچہ ان سب نے مل کر وہ گوبر کھا کر ختم کر دیا۔ پھر جب چوہیا کشتی میں رسیاں کاٹ کر فساد پھیلانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو وحی فرمائی کہ شیر کی دونوں آنکھوں کے درمیان مارو۔ انہوں نے جب ایسا کیا تو اس کی ناک سے ایک بلا اور ایک بلی نکلی اور دونوں نے چوہیا کو کھا لیا۔[43] اس طرح کی خرافات ہماری کتب میں پائی جاتی ہیں اور معلوم نہیں کہ قدیم کتابیں کب ایسے قصوں سے پاک ہوں گی کیونکہ اس طرح کی چیزیں مسلمانوں کی غفلت کے زمانے میں یہودیوں کی سازش سے داخل کر دی گئی ہیں۔[44]

قصہ غرانیق سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تاریخ و تفسیر کی بعض کتب میں اس گھڑی ہوئی افواہ کا ذکر آیا ہے جبکہ اتنی بے ہودہ بات ذکر کرنے کے قابل نہ تھی علامہ غزالی کے مطابق یہ واقعہ اس طرح نہیں پیش آیا تھا جس طرح ہمارے بعض مفسرین نے بیان کیا ہے۔ مشرکین نے جب قرآن کی آیات سنیں تو ان پر ایمان کا رعب و جلال اس قدر غالب آ گیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑے اور جب کھڑے ہوئے تو شرمندہ ہوئے اور یہ عذر گھڑنے لگے کہ ہم سجدہ میں اس لیے گئے تھے کہ آپ ﷺ نے ہمارے معبودوں کا ذکر احترام سے کیا تھا۔ وہ اپنے عذر کی تائید اسی طرح حاصل کر سکتے تھے کہ اپنی گھڑی ہوئی بات لوگوں میں پھیلائیں اور یہ وہم پیدا کریں کہ

آپ ﷺ کسی وقت ان کی طرف مائل ہو گئے تھے حالانکہ صنم پرستی کے خلاف حضرت محمد ﷺ کی جدوجہد دن بدن شدید تر ہوتی جا رہی تھی اور اسی طرح صنم پرستوں کی دشمنی بھی تو وہ کیونکر ایسا کر سکتے تھے۔[45]

موجودہ مسائل اور سیرت النبی ﷺ کی عصری تطبیق:

علامہ غزالی کا اسلوب عصر حاضر کے مسائل کے تناظر میں بہت اہم ہے۔ وہ اپنے اسلوب کے ذریعے واقعات سیرت کی تین جہات کو واضح کرتے ہیں۔ وہ معاشرہ میں رائج اچھے اور قبیح طریقوں کو واضح کرتے ہیں اور پھر اچھے طریقوں کی قرآن و سنت سے تائید پیش کرتے ہیں اور برے طریقوں کی تردید کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کی تحریر سیرت اور معاشرہ کے تطبیقی پہلوؤں کی حامل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آپ ان لوگوں کے رویے کا ذکر کرتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو محض گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا چاہیے۔ نہ وہ کسی کو دیکھ سکتی ہے اور نہ اسے کوئی دیکھے۔ اس کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زوجہ کے لیے یہ ناپسند فرمایا تھا کہ وہ نابینا صحابی عبد اللہؓ بن ام مکتوم کو دیکھیں۔[46]

اس خیال کی تردید میں آپ عہد نبوی ﷺ میں خواتین کے واقعات پیش کرتے ہیں۔ عہد نبوی ﷺ میں خواتین کئی مقاصد کے لیے گھر سے باہر نکلتی تھیں، جنگوں میں حصہ لیتی تھی، زخمیوں کا علاج کرتی تھیں اور سفر بھی کرتی تھیں۔ سورۃ النساء کی آیات[47] سے استدلال کرتے ہیں کہ عورتوں کو معاشرے سے کاٹ کر گھر کے اندر بند کر دینا درست نہیں ہے اور قرآن نے یہ حکم ان عورتوں کے لیے دیا ہے جو برائی کی مرتکب ہوں۔[48]

غزوہ بنو قریظہ کے بعد جب بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کیا جا رہا تھا تو ان کے سردار حی بن اخطب کو جب سزا کے لیے لایا گیا تو اس نے اپنے اعمال پر پچھتائے بغیر اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کر دیا۔ اس واقعہ سے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ مشرکین قریش اور یہودیوں میں سے بعض نے موت کا سامنا مردانہ وار کیا، باطل نظریات بھی ایسے پیروکاروں سے محروم نہیں ہوتے جو جان و مال اس پر نچھاور کر دیں لیکن اس سے باطل حق اور ظلم عدل نہیں بن جاتا۔ یہودیوں کا جو موقف اسلام کے بارے میں کل تھا وہی آج بھی ہے۔ فلسطین پر قبضہ کے سلسلہ میں ہزار ہا مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ یورپ کے ممالک میں جن لوگوں نے ان کا قتل عام کیا ان کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہے البتہ انہوں نے ان مسلمانوں کو ضرور کمزور سمجھ لیا جنہوں نے بارہ سو برسوں کے دوران ان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا۔ پھر ان کے ساتھ بدترین سلوک کیا جو آج بھی فلسطین میں مغربی ممالک کی تائید و حمایت سے جاری ہے۔[49]

بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد آپ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو تبلیغ کے لیے مدینہ بھیجا۔ علامہ محمد غزالی اس حوالے سے یہ بات واضح کرتے ہیں کہ حضرت مصعبؓ کو ان کرایہ کے مشنریوں جیسا نہ سمجھا جائے جنہیں مغربی استعمار نے مشرق پر حملے کے ساتھ دراندازی کر دیا کہ آپ ان میں سے کسی کو کسی مریض کے بستر کے پاس بیٹھ کر یہ کہتے پائیں کہ یہ جام صحت تمہارے لیے کنواری مریم نے بھیجا ہے یا یہ روٹی تمہارے لیے حضرت مسیحؑ نے تحفہ کے طور پر بھیجی ہے۔ ایسے مشنریوں کے کام بظاہر رفاہ عامہ کے لیے ہوتے ہیں لیکن ان کا مقصد اصل میں نوخیز نسل کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ یہ ایک روحانی ڈاکہ کی شکل ہے جو دین کی دعوت کے نام پر ڈالا جاتا ہے جو لوگ یہ مسخرہ پن کرتے ہیں انہیں ان ممالک سے حوصلہ افزائی ملتی ہے جو انہیں بھیجتے ہیں اور جو ہر طرح کی امداد سے انہیں اپنا کام جاری رکھنے

کی طاقت پہنچاتے ہیں۔ حضرت مصعبؓ کا پس منظر بالکل مختلف تھا۔ انہیں بھیجنے والے وہ نبی تھے جن کو اپنی قوم میں باغی تصور کیا جارہا تھا۔ حضرت مصعبؓ نے تو محض اپنی ذہانت، پختہ کردار، اخلاص اور اپنی قربانیوں سے لوگوں کے دل میں گھر کرلیا تھا اور لوگوں نے ان کے لیے اور اسلام کے لیے اپنے دریچے کھول دیے تھے۔[50]

علامہ محمد غزالی نے اس گفتگو میں عصر حاضر کے ایک بہت بڑے مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عیسائی مشنریوں نے مختلف شکلوں میں اپنے اہداف کے حصول کے لیے ادارے قائم کر رکھے ہیں اور سادہ لوح لوگ ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ مختلف طریقوں اور حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو ان کے دین سے دور کرنے کی کوششیں کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہیں بے پناہ وسائل حاصل ہوتے ہیں اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے علماء اور ارباب اختیار کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک جامع لائحہ عمل اپنائیں اور اس منظم حملے اور سازش کا مقابلہ کریں۔

غزوہ خندق میں بنو قریظہ کی غداری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ معاہدوں کے سلسلے میں بنی اسرائیل کا موقف قدیم زمانہ سے لے کر آج تک ایسا ہی رہا ہے کہ وہ اپنی کمینگی کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ جب تک معاہدے ان کی خواہشات اور فائدے کے مطابق رہتے ہیں تب تک وہ ان کی پاسداری کرتے ہیں اور جب ایسا نہیں رہ جاتا تو اسے بیکار گٹھلی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ قرآن کریم بنی اسرائیل کی اس گھناؤنی عادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس خصلت نے انہیں انسانوں سے جانوروں میں تبدیل کر دیا ہے۔[51]

علامہ غزالی نے بار بار یہودیوں کی غداری اور بدعہدی کا ذکر کرکے ان سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہے کیونکہ وہ کسی وعدے کی پاسداری نہیں کرتے ہیں۔ آج اگر دیکھا جائے تو بین الاقوامی سطح پر یہودی اور عیسائی صرف انہی بین الاقوامی قوانین کو مانتے ہیں جن میں ان کی طرفداری کی گئی ہو یا جو ان کے فائدے کے لیے ہوں۔ جب انہیں ان معاہدوں سے اپنا نقصان نظر آئے یا مسلمانوں کی بہتری محسوس ہو وہ ان کی پاسداری نہیں کرتے ہیں۔ اسرائیل کی مثال دنیا کے سامنے ہے جو مسلسل بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ایسے بین الاقوامی معاہدوں کے حوالے سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔

ذاتی رائے کا بیان:

علامہ غزالی کئی مقامات پر فقہی مسائل کے حوالے سے اپنی ذاتی رائے بھی بیان کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے عقلی دلائل کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ غزوہ بنو قریظہ کے وقت آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ:

لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ العَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ، فَأَدْرَكَ بَعْضُهُمُ العَصْرَ فِي الطَّرِيقِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَا نُصَلِّي حَتَّى نَأْتِيَهَا، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلْ نُصَلِّي، لَمْ يُرِدْ مِنَّا ذَلِكَ، فَذُكِرَ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُعَنِّفْ وَاحِدًا مِنْهُمْ[52]

"عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھنا جب تک بنو قریظہ نہ پہنچ جاؤ۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی سورج ڈوبنے لگا کچھ لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد نماز چھوڑنا نہیں تھا چنانچہ انہوں نے راستے میں ہی نماز پڑھ لی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے خیال کیا کہ نہیں رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی بجا آوری لازم ہے چنانچہ انہوں نے بنو قریظہ پہنچ کر ہی نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے کسی کو سرزنش نہیں کی۔"

بخاری اور دیگر کتب سیرت میں عصر کی نماز کا ذکر ہے لیکن بیہقی نے اپنی کتاب میں نماز ظہر کا ذکر کیا ہے لیکن سند وہی ہے جو امام بخاری کی ہے۔ اور انہوں نے اپنی کتاب میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کو امام بخاری اور امام مسلم نے بھی ذکر کیا ہے۔[53] اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ مختلف نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کے سلسلے میں جب تک ان کی بنیاد نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد پر ہو اسلام کے احترام ک دلیل ہے۔ دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہری حکم سے تجاوز نہیں کرتے دوسرے وہ جو حکم کے مقصد و حکمت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں چاہے وہ ظاہری مفہوم کے خلاف ہو۔ دونوں طرح کے لوگوں کے لیے ایمان اور ثواب کی نیت سفارشی ہوں گے چاہے وہ حق تک پہنچ سکے ہوں یا نہیں۔[54]

واقعات سیرت کی توقیت:

علامہ غزالی واقعات سیرت کی توقیت سے متعلق اختلاف کا ذکر نہیں کرتے لیکن انتہائی مختصر انداز میں کسی واقعہ کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کر دیتے ہیں۔ واقعہ افک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بہت سے سیرت نگار واقعہ افک اور غزوہ بنو مصطلق کو غزوہ احزاب کے بعد کے واقعات مانتے ہیں جبکہ میرے نزدیک امام ابن قیم وغیرہ کی تحقیق زیادہ درست لگتی ہے کہ یہ غزوہ خندق سے پہلے پانچویں ہجری سال کے واقعات ہیں۔[55] غزوہ بنو قریظہ کے بعد عینیہ بن حصن کی قیادت میں ڈاکوبدؤں نے مدینہ منورہ پر حملہ کیا اور اونٹ ہنکا کر واپس جانے لگے تو سلمہ بن الاکوعؓ نے ان کا پیچھا کیا اور وہ سب سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس واقعہ کی توقیت سے متعلق لکھتے ہیں کہ بخاری کی روایت کے مطابق یہ واقعہ حدیبیہ کے بعد ہوا اس سے پہلے نہیں اور شاید یہی زیادہ صحیح ہے۔[56]

مجموعی طور پر علامہ غزالی کا اختیار کردہ منہج کئی اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب کے مطالعہ کے بعد ان کے اسلوب سے متعلق مجموعی طور پر مندرجہ ذیل چیزیں سامنے آتی ہیں۔

1۔ ان کی کتاب کا نام فقہ السیرۃ ہے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ فقہ السیرۃ کے اسلوب کے حامل دوسرے سیرت نگاروں کی طرح انہوں نے واقعات سیرت سے بہت سے فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

2۔ مقالہ کے آغاز میں فقہ السیرۃ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ علامہ محمد غزالی نے ان کے برعکس فقہ السیرۃ کا لغوی مفہوم مراد لیا ہے۔

3۔ علامہ محمد غزالی نے واقعات سیرت سے فقہی مسائل کے اخذ و استنباط کی بجائے سیرت کی حقیقی تفہیم پر زور دیا ہے اور سیرت کی روشنی میں موجودہ مسائل کے حل کی نشاندہی کی ہے۔

4۔ واقعات سیرت سے فقہی مسائل کا استنباط نہ ہونے کے برابر ہے اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہاں کسی امام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور کسی فقہی مسلک کی نمائندگی نظر نہیں آتی ہے۔

5۔ واقعات سیرت کی توقیت کے حوالے سے انتہائی اختصار کو اپنایا ہے اور کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے وقت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

6۔ ان کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے جا بجا عصر حاضر کے مسائل سے نمٹنے کے لیے سیرت مبارکہ سے

رہنمائی لینے کی تلقین کی ہے۔ خاص طور پر یہودیوں کی طرف سے اسلام کو جو درپیش خطرات ہیں ان سے آگاہ کرتے ہیں اور اس قوم کی ذہنی اور اخلاقی پستی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

7۔ انہوں نے کئی مواقع پر مسلمانوں کی بے عملی کی شکایت کی ہے اور مسلمانوں کے غیر ضروری ابحاث میں الجھنے پر تنقید کی ہے۔ ان کے مطابق بحث و مباحثہ اور غیر ضروری اعتراضات کی بجائے احکام پر عمل کو اہمیت دی جانی چاہیے۔

8۔ انہوں نے کتاب کے شروع میں ہی ایک اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج مسلمان سیرت مبارکہ کی حقیقی تفہیم کی بجائے مصنوعی عقیدت کے اظہار میں اپنی حدوں کو پار کر رہے ہیں۔

9۔ ان کی کتاب سے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ واقعات سیرت کی جزئیات بیان کرنے کی بجائے اصلاح معاشرہ اور اس سلسلے میں سیرت مبارکہ سے رہنمائی لینے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

10۔ ان کی کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے واقعات سیرت کو قرآن کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقریباً ہر واقعہ سے متعلق قرآنی آیات پیش کرتے ہیں اور اس طرح آیات کا شان نزول بھی سامنے آجاتا ہے۔ ان کی کتاب کو قرآن کی روشنی میں سیرت رسول ﷺ قرار دیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ بحث:

علامہ محمد غزالی نے واقعات سیرت کو انتہائی مختصر لیکن جامع انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ سیرت رسول ﷺ سے رہنمائی لینے کی تلقین کی ہے اور جا بجا اپنی کتاب سے عملی طور پر اس کام کے لیے تجاویز دی ہیں اور راستہ متعین کیا ہے جس پر چل کر امت مسلمہ اپنے مسائل سے نبرد آزما ہو سکتی ہے۔ کتاب میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ اختصار کو اپنایا گیا ہے۔ سنت کی آئینی و قانونی حیثیت کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ قرآن پاک سے سیرت رسول ﷺ کا ربط ثابت کیا گیا ہے۔ واقعات سیرت سے اسباق کے حصول کی کوشش کی گئی ہے جن کی مدد سے بہت سارے عصری مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ غیر مستند اور غیر مصدقہ روایات پر تنقید کی ہے اور ان کی تصحیح کی کوشش کی ہے۔ آپ ﷺ کے افعال کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں سیرت کی حقیقی تفہیم کو واضح کرنے کی شاندار کوشش کی گئی ہے۔ اس حوالے سے تو اس کے نام کے ساتھ فقہ کو جوڑا جاسکتا ہے لیکن فقہ السیرۃ کا جو مفہوم عمومی طور پر سیرت نگاروں نے لیا ہے اس کے مطابق اس کو فقہ السیرۃ کی کتاب شمار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔ فقہ کا لغوی معنی مراد لیا جائے تو اس صورت میں اس کتاب کا نام اس کے مندرجات سے مطابقت رکھتا ہے لیکن فقہ السیرۃ کا اصطلاحی مفہوم مراد لیا جائے تو پھر کتاب کے نام اور اس کے مندرجات میں مطابقت کی شدید کمی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب میں واقعات سیرت سے فقہی احکام کے مسائل کا استنباط بہت کم کیا گیا ہے۔ چند مقامات پر مبہم انداز میں فقہی احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو فقہ السیرۃ کے نام سے مناسبت نہیں رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر علامہ محمد غزالی کی کتاب کو فقہ السیرۃ کے لغوی مفہوم پر مشتمل ایک شاندار کتاب قرار دیا جاسکتا ہے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 international license.

حواشی وحوالہ جات

[1]۔فاروق حمادہ،الدکتور،مصادر السیرۃ النبویۃ و تقویمھا،دمشق،دار القلم،س ن،ص159

[2]۔غازی،محمود احمد،ڈاکٹر،محاضرات سیرت،الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور،2007ء،ص532

[3]۔ہاشمی،شاہ معین الدین،ڈاکٹر،بیسویں صدی میں فقہ السیرۃ کا رجحان،فکر و نظر،سہ ماہی،اسلام آباد،ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،جلد49، شمارہ3۔2،اکتوبر۔نومبر۔دسمبر،مارچ2012ء،ص112

[4]۔محمد غزالی،فقہ السیرۃ،بیروت،دار احیاء التراث العربی،2002ء،17۔

[5]۔غزالی،فقہ السیرۃ،مقدمہ،6۔

[6]۔مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔النساء4 :80۔

[7]۔محمد غزالی،فقہ السیرۃ(مترجم اظہر ندوی)،لاہور،نشریات،2010ء،36۔

[8]۔غزالی،فقہ السیرۃ،45۔

[9]۔محمد غزالی،فقہ السیرۃ،بیروت،76۔

[10]۔محمد غزالی،فقہ السیرۃ(مترجم)نشریات لاہور،122۔

[11]۔القرآن:آل عمران3 :31۔

[12]۔القرآن:بنی اسرائیل17 :93۔

[13]۔محمد غزالی،فقہ السیرۃ،246۔

[14]۔ایضاً،257۔

[15]۔ایضاً،263۔

[16]۔ایضاً،149۔

[17]۔القرآن:آل عمران3 :179۔

[18]۔محمد غزالی،فقہ السیرۃ،233۔

[19]۔ایضاً،337۔

[20]۔القرآن:النساء4 :175،174۔

[21]۔القرآن:طٰہٰ20 :19۔23۔

[22]۔القرآن:طٰہٰ20 :24۔

[23]۔القرآن:بنی اسرائیل17 :93۔

[24]۔فقہ السیرۃ:126۔

[25]۔القرآن:الانفال8 :60۔

[26]۔غزالی،فقہ السیرۃ،191،190۔

[27]۔ایضاً،301۔

[28]۔ابن ہشام،سیرت ابن ہشام،(مترجم)،3: 108۔

[29]۔ غزالی، فقہ السیرۃ، 62۔

[30]۔ غزالی، فقہ السیرۃ، 186۔

[31]۔ غزالی، فقہ السیرۃ، 186۔

[32]۔ ایضاً، 276۔

[33]۔ ایضاً، 346۔

[34]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ (عربی)، 373۔

[35]۔ القرآن: الممتحنہ 60: 10۔

[36]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، (عربی)، 340۔

[37]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، باب رعی الغنم علی قراریط، 1: 596، حدیث 2262۔

[38]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، 65۔

[39]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، 85۔

[40]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، 123۔

[41]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل، 1: 1036، حدیث 3828۔

[42]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، 78۔

[43]۔ الخازن، ابو الحسن علاء الدین علی بن محمد (م 741ھ)، لباب التاویل فی معانی التنزیل، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، 1415ھ، 2: 483۔

[44]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، 105۔

[45]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، 106۔

[46]۔ ایضاً، 44۔

[47]۔ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْھُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا "اور جو کوئی ارتکاب کرے بدکاری کا تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کرو (تہمت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو بدن کر دو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ پورا کر دے ان (کی زندگی) کو موت یا بنا دے اللہ تعالیٰ ان (کی رہائی) کے لیے کوئی رستہ۔" النساء 4: 15۔

[48]۔ محمد غزالی، فقہ السیرۃ، 44۔

[49]۔ غزالی، فقہ السیرۃ، 282۔

[50]۔ غزالی، فقہ السیرۃ، 127۔

[51]۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ۔ القرآن: الانفال 8: 56،55۔

[52]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، 2: 1118، حدیث 4119۔

[53]۔ البیہقی، احمد بن الحسین بن علی (م 458ھ)، السنن الکبری، 10: 230، حدیث 20370۔

[54]۔ غزالی، فقہ السیرۃ، 276۔

[55]۔ ایضاً، 259۔

[56]۔ ایضاً، 285۔